اقبال، شام اور مذہبی تحمل

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

دمشق کو ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ دیکھنے کی ہوس تھی یا اقبال کے پیغام کی کشش کہ مجھے جامعہ دمشق کے کلیہ شریعہ کی طرف سے ایک بین الاقوامی کانفرنس ''موتمر التسامح الدینی فی الشریعہ الاسلامیہ'' میں شرکت کا بلاوا آ گیا۔ قاہرہ کی گوناگوں مصروفیات میں ایک بار پھر بیرونی سفر کے لیے وقت نکالنا اور محدود مدت میں مقالہ تیار کرنا آسان نہ تھا لیکن اقبال کے پیغام کی محبت نے اسے آسان کر دیا میں نے اپنے لیے مذہبی تحمل و برداشت کے حوالے سے کلام اقبال کے مطالعے کا موضوع منتخب کیا جسے میزبان یونی ورسٹی نے بلا تامل قبول کر لیا۔ سفارت خانوں کے کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد میں نے دمشق آمد کی اطلاع کلیہ شریعہ جامعہ دمشق کے ڈین ڈاکٹر محمد الحسن البغا کو دے دی اور یوں دس جولائی ۲۰۰۹ء کی سہ پہر کو میں ایک بار پھر دمشق ایرپورٹ پر تھا۔ میزبان یونی ورسٹی کے نمائندے نے استقبال کیا اور وہ مجھے جامعہ دمشق کی گاڑی میں بٹھا کر فندق فردوس دمشق لے گیا۔ یہاں عالم عرب کے متعدد ممالک کے سکالرز آئے ہوئے تھے اور باقی ابھی آ رہے تھے۔ رات تک مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اگلے دن صبح یونی ورسٹی کی گاڑی ہمیں ہوٹل سے جامعہ دمشق کے کانفرنس سنٹر قاعۃ رضا سعید للموتمرات لے گئی جہاں سوا نو بجے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کا پرجوش آغاز ہوا اجلاس کے کمپیر ڈاکٹر علی اسعد نے التسامح کے لفظ پر روشنی ڈالی اور موجودہ حالات میں اس کی اہمیت پر زور دیا ان تمہیدی کلمات کے بعد شام کا قومی ترانہ نشید العربیۃ السّوریۃ بجایا گیا جس کے احترام میں سب مہمان کھڑے ہوئے۔

قومی ترانے کے بعد تلاوت ہوئی سورہ النحل کی وہ آیات جن میں حضرت ابراہیمؑ کی یکسوئی اور اصول دعوت کا بیان ہے تلاوت کی گئیں[1] کانفرنس کا موضوع چونکہ دینی تحمل اور برداشت تھا اور تین بڑے سماوی ادیان میں حضرت ابراہیمؑ یکساں محترم ہیں اس لیے اس موقع پر ان آیات کا انتخاب بہت مناسب تھا۔ امت کو آج جہاں بقائے باہم کے لیے تسامح یعنی تحمل و برداشت کی ضرورت ہے وہاں دعوت کے لیے بھی

حکمت اور اور موعظہ حسنہ کی ضرورت ہے اس لیے قرآن کا یہ پیغام ہماری توجہ چاہتا ہے کہ بے شک ابراہیم اللہ کے تابع فرمان اور یک سوپیش وا تھے، وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے اللہ نے انھیں چن لیا تھا اور راہ راست کا شعور عطا کر دیا تھا اس طرح انھیں دنیا میں بھی بہتری دی گئی اور آخرت میں بھی ان کا شمار صالحین میں ہوگا، رسول اللہ ؐ کو بھی ان کی پیروی کا حکم دیا گیا وہ جو یک سو تھے (یک سوئی، پریشان خیالی کی ضد ہے) اور جن کا عمل آلودۂ شرک نہیں تھا اسی مقام پر اصول دعوت بھی بیان کیا گیا کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے حکمت، خیر خواہی، بہترین نصیحت، رفق، ملائمت، مہربانی، جدال بالاحسن، اور شفقت کی ضرورت ہوتی ہے درشتی، شدت اور تلخی کی نہیں......کاش دین کی بنا پر شدید رویے اپنانے والے قرآن کے اس پیغام پر غور کریں۔اسی آیت میں متصلاً خالقِ کائنات نے یہ بھی کہا ہے کہ یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں کو بھی بخوبی جانتا ہے اور وہ راہ یافتہ لوگوں سے بھی پورا واقف ہے۔دیکھیے، نورِ قرآنی سے مستنیر، اقبال کی آواز کتنی واضح ہے:

بے خبر از سرّ دین اند ایں ہمہ
اہل کین اند اہل کین اند ایں ہمہ
’اہل دیں را باز داں از اہل کیں
ہم نشینِ حق بجو با او نشیں‘[۲]

عالمی اور بالخصوص عالم اسلام کے حالات کے تناظر میں ان آیات کی تلاوت اور شام کے خوش گلو قاری کی آواز نے سماں باندھ دیا۔کانفرنس کا تعارف بھی ہو چکا، قومی ترانہ بھی اور اب تلاوت بھی ہوگئی لیکن ابھی تک مہمانوں کو سٹیج پر رکھی کرسیاں سنبھالنے کی دعوت نہیں دی گئی تھی، شام کے وزیر اوقاف کا استقبال کیا گیا اور ایک بار پھر سٹیج سیکریٹری نے ایک ایسے زمانے میں جب کہ تہذیبوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے اس کانفرنس کے انعقاد کی غرض و غایت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔اور شام کے ایک بزرگ سکالر الاستاذ الدکتور وہبی الزحیلی کو خطاب کی دعوت دی گئی انھوں نے جامعہ دمشق کی طرف سے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ وہ اگرچہ کہن سال بزرگ تھے لیکن ان کا لب ولہجہ اور انداز بہت پر جوش تھا انھوں نے التسامح کے مفہوم کو روشن کرتے ہوئے موجودہ عالمی صورتِ حال میں اسلام کے مقام اور مسلمانوں کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ان کا خطاب خاصا تفصیلی تھا لیکن انداز بیان کے باعث طول کلام بوجھل نہیں ہوا۔وہبہ الزحیلی میزبانوں کے نمائندے تھے تو اب مہمانوں کے نمائندے کی باری تھی چنانچہ مہمانوں کی طرف سے الموسسات المالیہ الاسلامیہ قطر کے پروفیسر ڈاکٹر علی القرضاوی کو دعوت دی گئی انھوں نے جامعہ کی جانب سے حسن استقبال کو سراہتے ہوئے رئیس الجامعہ اور عمید الکلیہ کا شکریہ ادا کیا۔دمشق شہر کی تعریف کی یہاں

کے تاریخی آثار اور اس کی اہمیت کا بیان کیا۔ عربی اشعار سے اپنی تقریر کو سجایا اس وقت مسلمانوں کے بڑے مسئلے کی حیثیت سے مسئلہ فلسطین کا ذکر کیا اور غزہ پر اسرائیل کے ظلم و ستم کی مذمت کی، ان کا کہنا تھا کہ اس پس منظر میں اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے یہ ایک موزوں وقت ہے۔

ڈاکٹر قرضاوی کے بعد کانفرنس کے مہتمم اور عمید الکلیہ کی حیثیت سے ہمارے براہ راست میزبان پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن مصطفیٰ البغا کا خطاب تھا انھوں نے قرآن حکیم کے حوالے سے اس حقیقت کو روشن کیا کہ سب انسان ایک آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا اس لیے بقائے اصلح کی اس دنیا میں تفوق و برتری کی بنیاد نسل و قومیت نہیں ہے۔ اس اجلاس کی آخری تقریر جامعہ دمشق کے وائس چانسلر الاستاذ الدکتور السید وائل المعلیٰ کی تھی انھوں نے بحیثیت سربراہ ادارہ انبیا و صلحا کی اس سرزمین پر تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہا دمشق کی تاریخی اہمیت بیان کی اپنے ایک پیش رو مقرر کی طرح انھوں نے بھی مسلمانوں کے بڑے مسئلے کے طور پر فلسطین کے مسئلے کا ذکر کیا۔ عالم اسلام میں کسی کو اس مسئلے کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن آج عالم اسلام دہشت گردی کے جس عذاب سے گزر رہا ہے اسے کسی مقرر نے موضوع سخن نہیں بنایا۔ اگرچہ کانفرنس کا موضوع اس مسئلے کے ساتھ براہ راست متعلق تھا لیکن بعد میں پیش کیے جانے والے مقالات بھی زیادہ تر اکیڈیمک تھے عصری صورت حال کم ہی زیر بحث آسکی۔ راقم کا مقالہ کانفرنس کے تیسرے سیشن میں تھا، راقم کا مقالہ اس کانفرنس میں پیش کیا جانے والا واحد انگریزی مقالہ تھا مقالے کا عنوان *Religious Tolerance and Muhammad Iqbal's Philosophy* تھا۔ میرے ساتھ جن دوسرے مقالہ نگاروں نے اس سیشن میں اپنے مقالات پیش کیے ان میں ڈاکٹر نصار نصار ڈاکٹر فریدہ جاوید اور ڈاکٹر علی عکام شامل تھے ڈاکٹر نصار پاکستان میں رہ چکے ہیں اور کسی حد تک اردو سے آشنا ہیں ان کے مقالے کا عنوان اسس التعایش فی الاسلام تھا جبکہ ڈاکٹر علی عکام کا مقالہ منہج الدفع بالحسنیٰ (رویہ قرآنیہ) اور ڈاکٹر فریدہ جاید کا مقالہ السماحۃ فی الفقہ الاسلامی کے موضوع پر تھا۔ راقم نے اپنے مقالے میں کہا:

وحدت آدم کی بنیاد احترامِ آدم پر استوار ہے۔ اسلام احترام آدم کی تعلیم دیتا ہے تمام دنیا کو ایک کنبہ قرار دینے والے دین اور اس کے نبی نے ایک اسلامی مملکت میں اہل اسلام ہی کی نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کی بھی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی نجران کے عیسائیوں کے وفد نے جب مسجد نبوی میں مذاکرات کے بعد عبادت کے لیے جگہ دریافت کی تو رسول اللہ نے انھیں مسجد نبوی ہی میں عبادت کرنے کے لیے کہا فتح مکہ کے بعد آپ نے عیسائیوں اور یہودیوں کی املاک اور جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ جس کا مظاہرہ بعد میں آپ کے پیروکاروں کی حکومتوں میں بھی دیکھا گیا۔ جس کا اعتراف برٹرینڈ رسل جیسے مذہب مخالف مفکر نے بھی اپنی کتاب[۳] *Why I Am Not A Christian?* میں کیا ہے۔

رسول اللہ نے دین کو خیر خواہی قرار دیا۔ خیر خواہی کا کلمہ دین اور دنیا کے تمام امور کا جامع ہے۔ ایک سچا خیر خواہ دوسروں کو گھٹیا نہیں سمجھتا ان کے احترام میں کمی نہیں کرتا ان کے رسوم و رواج کو نشانہ تضحیک بناتا ہے نہ ان کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لیے کوشش کرتا ہے۔ وسیع المشربی کے حامل اس اسلامی رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے کہ جو فرقہ دوسرے فرقوں کی طرف بدخواہی کے جذبات رکھتا ہو وہ نیچ اور ذلیل ہے میں دوسری قوموں کے رسوم، قوانین، معاشرتی اور مذہبی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں، یہی نہیں بلکہ قرانِ پاک کی تعلیم کے مطابق ضرورت پڑے تو ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی میرا فرض ہے۔ شاعری میں بھی اقبال کا یہی رویہ ہے جہاں وہ کہتے ہیں:

آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقام آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دین را گیر در پہنای دل
دل اگر بگریزد از دل وای دل[۴]

اقبال ہر گروہ کو یہ حق دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی تہذیبی روایات کے مطابق آزادی سے زندگی گزار سکے انھوں نے اس خیال کا اظہار اپنے الہ آباد کے مشہور خطبے میں کیا تھا وہی خطبہ جس میں مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک الگ اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا گیا تھا جس کی بنا پر بعد ازاں اپنے وقت کی سب سے بڑی مسلم ریاست اسلامی جمہوریہ پاکستان قائم ہوئی۔ آج دنیا جن حالات سے دوچار ہے ان میں پاکستان ہی کو نہیں نفس اسلام کو چیلنج درپیش ہے اقبال نے اس کا ادراک کرتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں کہا تھا: ''میری ناقص رائے میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا''۔[۵]

اقبال اپنے مطالعے اور مشاہدے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دنیا کی فلاح اخوت انسانی اور مساوات کے تصورات میں ہے اور دنیا کو ان تصورات کا سبق اسلام ہی نے دیا ہے چنانچہ اقبال نے واضح کیا ہے کہ میرا مقصد سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی ہے میں سمجھتا ہوں کہ صرف مسلمان نہیں بلکہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور انسانوں کی نجات مساوات میں ہے رنگ و نسل کا تصور انسانیت کے اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اسلام اس کا سب سے بڑا مخالف ہے اور میرا مقصد ایک عالمی سماجی نظام کی تشکیل کرنا ہے

اس راہ میں سفر کرتے ہوئے اگر ایک ایسا نظام پہلے سے موجود مل جائے جس کا مقصد ہی ذات پات، رنگ ونسل اور انسان ساختہ بتوں کے امتیازات کا خاتمہ ہو اور جو دنیوی معاملات میں بہت باریک بین ہو اور جو ایثار کا سبق بھی دیتا ہو اور جو ہمسایوں کے حقوق کی تلقین بھی کرتا ہو تو اس کی طرف مائل ہونا چاہیے۔

راقم نے سیموئل پی ہنٹنگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے نظریے[۶] اور مصر کی مشہور یونی ورسٹی جامعہ قاہرہ سے امریکی صدر باراک حسین اوباما کے عالم اسلام سے خطاب[۷] کے حوالے سے یہ بھی کہا کہ قرآن نے بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے ایک دستور العمل وضع کر دیا ہے اسے بنیاد بنا کر دنیا کو کشمکش اور جنگ کی موجودہ صورت سے نجات دلوائی جا سکتی ہے۔ یہ دستور العمل سورہ آل عمران[۸] میں بیان کیا گیا ہے کہ توجہ ان امور کی جانب مرتکز کرنی چاہیے جو مشترک ہوں نہ کہ ان امور کی جانب جو مختلف ہوں یہ ایک مثبت زاویہ نظر کی طرف راہ نمائی کرنے والی آیت ہے اقبال نے اس آیہ مبارکہ کو یکساں اخلاقی نصب العین رکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کی دعوت قرار دیا ہے۔ راقم کے مقالے کا عربی ترجمہ جامعہ دمشق کے شعبہ انگریزی کے استاد پروفیسر اسماعیل یاسین نے کیا مقالات کے بعد سوالات کا سیشن تھا جس میں آغاز مجھی سے کیا گیا ایک صاحب نے التسامح کے انگریزی ترجمے کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس عربی کا لفظ عفو اس کا ہم معنی ہے جس کا ترجمہ Tolerance سے نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کا یہ اعتراض درست نہیں تھا اس لیے کہ عالم عرب میں التسامح کے لیے Tolerance کا ترجمہ مسلم حیثیت اختیار کر چکا ہے چنانچہ صدر جلسہ نے اس سوال کے جواب کو غیر ضروری قرار دیا۔ عالم عرب میں عام طور سے سوالات کے سیشن میں سوال کم ہوتے ہیں مقالات پر اظہار خیال زیادہ کیا جاتا ہے جو بعض اوقات تو اتنا طول کھینچتا ہے کہ ایک نئی تقریر کی صورت پیدا ہو جاتی ہے یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا بہ ہر حال مجموعی طور پر مقالے کو سراہا گیا اور خاص طور پر اس بات کو پسند کیا گیا کہ اس مقالے میں تسامح کو لبرل ازم سے نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے متعلق بتایا گیا ہے۔

کانفرنس کے مختلف سیشنز کے دوران میں جب وقفہ آتا تو قاعۃ رضا سعید للموتمرات کے دائیں بائیں بنے ہوئے طول طویل کمروں میں جہاں چائے کا سلسلہ چلتا وہیں مختلف علمی موضوعات کی توسیع بھی ہوتی یہاں بھی راقم عالم اسلام اور عرب کے حوالے سے اقبال کے خیالات اہل عرب تک پہنچاتا رہا۔ انھی وقفوں کے دوران پروفیسر اسماعیل یاسین مجھے اپنے کچھ احباب سے ملوانے کے لیے اسی علاقے کی ایک تجارتی عمارت میں لے گئے یہاں ایک مکتبے پر ان کے ایک عزیز نے چائے کا اہتمام کیا۔ اس محفل میں بھی شامی حضرات سے دلچسپ گفتگو رہی، یہاں راقم کا ایک مقالہ جو اس نے مسئلہ فلسطین پر اقبال کے خیالات کے حوالے سے لکھا تھا اور جو مصر سے شائع ہو چکا ہے، زیر بحث آیا، راقم نے جب انھیں شام کے بارے میں

اقبال کے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ لوگ بہت حیران ہوئے خاص طور پر اقبال کے وہ اشعار سن کر جو انھوں نے ''یورپ اور سوریا'' کے عنوان سے لکھے تھے:

فرنگیوں کو عطا خاک سوریا نے کیا
نبی عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مے و قمار و ہجوم زنان بازاری[۹]

ان حضرات کے لیے یہ بات ہی تعجب کا باعث تھی کہ پاکستان کے کسی شاعر نے ان کے ملک کے بارے میں اتنی توجہ اور گہرائی سے سوچا ہے اس محفل کے اکثر احباب کا کہنا تھا کہ یہ تو بالکل آج کے شام کا منظر نامہ ہے حالانکہ اقبال نے یہ خیالات ۱۹۳۶ء میں شائع کیے تھے۔

حوالہ جات وحواشی

۱- القرآن ۱۶:۱۲۱-۱۲۳۔
۲- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۷۹۵۔
3- Russell, B, *Why I Am Not A Christian?* London, George Allen and Unwin, 1957, p16.
اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے دیکھیے: پروفیسر امیر خان حکمت (مترجم)، میں عیسائی کیوں نہیں ہوں؟ از لارڈ برٹرینڈ رسل لاہور، بک ٹائم ۲۰۱۱ء۔
۴- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۷۹۳۔
۵- صوفی تبسم کے نام خط مورخہ ۲/ستمبر ۱۹۲۵ء در اقبال نامہ یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال لاہور، شیخ محمد اشرف پبلشرز ۱۹۵۱ء، حصہ دوم، ص ۹۹۔
6- Huntington, Samuel P. *The Clash of Civilizations and the Remaking of New World Order*, New York, Simon and Schuster, 1998.
۷- یہ تقریر بہ کثرت شائع ہوئی ہمارا ماخذ *The Egyptian Gazette* Cairo May 5,2009 ہے۔
۸- القرآن ۳:۶۴۔
۹- اقبال، کلیات اقبال اردو لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۴ء ص ۱۴۹۔